شذرات

حال ہی میں سعودی عرب میں شاہ سعود کو مسند اقتدار سے برطرف کر کے ان کے چھوٹے بھائی اور ولی عہد سلطنت امیر فیصل کو بادشاہ بنا دیا گیا ہے۔ گو یہ تبدیلی پُرامن طریقے سے ہوئی اور اس سلسلے میں نہ کوئی ہنگامہ ہوا اور نہ کسی کا خون بہا، لیکن شاہ سعود کی جگہ امیر فیصل کا بادشاہ بننا سعودی عرب میں ایک بہت بڑے "انقلاب" کی نشان دہی کرتا ہے، اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربی ممالک میں اندر ہی اندر کیا اجتماعی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور آہستہ آہستہ سیاسی اقتدار کس طبقے کے ہاتھ میں جا رہا ہے۔ دراصل یمن میں صدیوں کی "اماموں" کی خاندانی حکومت کے بعد جنرل سلّال کا وہاں جمہوریت قائم کرنا جزیرۂ عرب کے لئے ایک بڑے دور رس اور ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ ہے، اور سعودی عرب میں جو کچھ ہوا اسے اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔

شاہ سعود کے اقتدار کے پشت پناہ زیادہ تر وہ طبقے تھے جنہیں ہم قدامت پسند کہتے ہیں اور ان میں سے اکثریت نجد کے قبائلی سرداروں کی تھی۔ گو انہوں نے نئے زمانے کی تمام مادّی "طیبات" کو اپنا لیا تھا۔ اور بظاہر ان کا رہن سہن بالکل "ماڈرن" تھا، لیکن ذہناً وہ نئے زمانے کے تقاضوں کیسامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھے وہ نہ تو حکومت کے نظم و نسق کو آج کی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے حق میں تھے اور نہ وہ اس پر آمادہ تھے کہ مالیات میں شاہی تصرفات پر کوئی روک ٹوک ہو۔ گو فیصل کو برسر اقتدار لانے میں علماء اور مشائخ کے علاوہ خود شاہی خاندان کے بعض افراد کا بھی ہاتھ ہے لیکن فیصل کی اصل طاقت حجاز و نجد کا وہ طبقہ ہے جسے عربی میں "متنورین" یعنی روشن خیال کہا جاتا ہے، خود شاہ فیصل عربی کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہیں اور ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ نجد کے بجائے حجاز میں گزرا ہے پھر اپنے مرحوم والد کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی وہ برابر و زبردست خارجہ رہے۔ اور اس حیثیت سے وہ سعودی عرب سے باہر کی دنیا کو خوب جانتے ہیں۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک عربی دنیا میں دو طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھیں، ایک طرف سعودی عرب

اور یمن کی خاندانی و شخصی امارت حد تک مطلق العنان بادشاہتیں تھیں۔ اور دوسری طرف مصر و شام و عراق کی جمہوری قوتیں تھیں، اس نظام کا پہلا نشانہ یمن بنا، جہاں جنرل سلال یمن کے فرمانروا امام بدر کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا اب عرب جمہوری قوتوں کی زد سعودی عرب پر تھی۔ خدانخواستہ اگر وہاں کچھ دیر وہی نظام حکومت رہتا، جس کے مظہر شاہ سعود تھے۔ تو کچھ بعید نہ تھا کہ سعودی عرب کا بھی وہ حشر ہوتا، جو یمن کا ہوا۔ لیکن شاہ فیصل کے برسر اقتدار آنے اور حجاز و نجد کے طبقۂ "متنورین" کے شریک حکومت ہونے سے بہت اغلب ہے کہ ضروری اصلاح احوال بغیر انتہا پسندانہ ذرائع کے ہی ہو جائے۔

گذشتہ صدی کے اوائل ہی سے مسلمان ملکوں میں قدامت پسندی اور تجدید کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے ترکی اس کے نرغے میں آیا، اور چونکہ وہاں کے قدامت پسند گروہ نے زمانے کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے وہاں اس کا ردِ عمل بھی بڑا شدید ہوا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے کچھ بعد کا واقعہ ہے۔ اب دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک ایک کر کے تمام عرب ملکوں میں بھی قدامت پسندی اور تجدید کی یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے مصر بہت حد تک تجدید کا ہراول ہے۔ اور وہ اس لئے کہ وہاں نیا تعلیم یافتہ "متنورین" کا طبقہ دوسرے عرب ممالک سے بہت زیادہ ہے اور ناصریا ناصریت دراصل اسی طبقے کی فطری امنگوں کا ایک عملی مظہر ہے۔

خدا کرے شاہ فیصل کے برسر اقتدار آنے سے سعودی عرب اس افراط و تفریط سے بچ کر راہ اعتدال پر گامزن ہو سکے۔ اور اس طرح یہ سرزمین مقدس جو مہبط وحی ہے اور جہاں دنیا کے کونے کونے سے ہر سال لاکھوں مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے آتے ہیں، وہ نہ صرف عربی ممالک کے لئے بلکہ کل دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ بن سکے

زندگی کے کسی دور میں بھی نہ تو قدامت سے انکار ممکن ہے اور نہ جدید سے ہی آنکھیں بند کی جا سکتی ہیں ضرورت زندگی کے معنوی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے قدیم و جدید کو ہم آہنگ کر کے آگے بڑھنے کی ہوتی ہے۔ ہم مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے قدیم اور جدید طبقے ایک دوسرے سے الگ الگ دو متوازی راہوں پر چل رہے ہیں۔ غیر ملکی حکومتوں کے دوران تو ان کی باہمی کشمکش جو فطری ہے، دبی رہی۔ لیکن جیسے جیسے یہ مسلمان ملک سیاسی طور سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں، ان کے قدیم اور جدید طبقوں کی یہ کشمکش بلکہ مخاصمت اوپر سطح پر آتی جا رہی ہے، اور اکثر جگہ اس نے باقاعدہ تصادم کی شکل اختیار کر لی ہے اس میں شک نہیں کہ

مسلمان ملکوں کے جدید طبقے ان کی کل آبادی میں اقلیت میں ہیں، لیکن اتفاق سے بیشتر مادی وسائل ان کے قبضے میں ہیں، پھر ان ملکوں کا نیا معاشی و صنعتی نظام بھی انہی کے لئے زیادہ سازگار ہے، چنانچہ اس ڈیڑھ صدی میں جس مسلمان ملک میں بھی قدیم و جدید کا کھلم کھلا تصادم ہوا۔ یہی دیکھنے میں آیا کہ اس میں بہت جدید طبقوں کی ہوئی اور قدیم گروہ کو مجبوراً ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس کی تازہ ترین مثال وہ سیاسی تبدیلی ہے جو حال ہی سعودی عرب میں ہوئی اس کی ابتدا ترکی میں سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء - ۱۸۳۹ء) اور مصر میں محمد علی پاشا سے ہوئی جنہوں نے سب سے پہلے فوج کو یورپی طرز پر منظم کیا۔ اور جو اس کے مخالف تھے انہیں بڑی سفاکی سے کچل دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں قدیم و جدید کا اس طرح کا تصادم مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی معنوی و مادی دونوں حیثیتوں کے لئے بڑا نقصان دہ ہے۔ اب جب کہ غیر ملکی حکومتوں اور خود اپنے مستبد و مطلق العنان ملکی حاکموں کے بجائے سیاسی اقتدار خود مسلمان جمہور کو منتقل ہو رہا ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ قدیم و جدید طبقوں میں پچھلے ڈیڑھ سو میں جو بُعد پیدا ہو گیا ہے، اسے دور کرنے کی کوششیں ہوں۔ اور مسلمان بحیثیت مجموعی نہ کہ ان کا ایک مخصوص طبقہ زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھے۔ اور قدیم و جدید کی موجودہ کشمکش ختم ہو۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، یہاں کی صورت حال یہ ہے کہ قدیم یا دوسرے لفظوں میں دینی طبقوں کی اپنی دنیا ہے، اور وہ طبقہ جو نئے طریقہ تعلیم کی پیداوار ہیں، ان کی اپنی دنیا ہے مومنی طبقہ اپنے پرانے مسلک پر بدستور گامزن رہنا چاہتا ہے۔ انہوں نے مذہبی انجمنوں اور عربی مدارس کی اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں بنا رکھی ہیں، وہ انہیں ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آج اس دور میں نو آزاد مسلمان قومی حکومتوں کو جس قسم کی فکری و عملی اجتماعیت کی ضرورت ہے وہ اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں اسی طرح جدید طبقے بے عنان آگے کو سرپٹ دوڑنا چاہتے ہیں۔

اس قدیم اور جدید کے روز افزوں بُعد کو بعض مسلمان ملکوں میں محکمۂ اوقاف اور اس سے متعلق جامعات جیسے تعلیمی اداروں سے دور کرنے کی کوشش ہو رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی اس بُعد کو صرف اس طرح دور کیا جا سکتا ہے، ورنہ آگے چل کر اس کا نتیجہ وہی ہوگا، جو بعض دوسرے مسلمان ملکوں میں ہو چکا ہے